قصاص

شام کے ٹھیک پانچ بجے موبے کلیام سے چل کر جب دونوں بھائی پتوکی پہنچے تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور سردیوں کی شام گہری ہونے لگی تھی۔ انہوں نے سیون اپ کی ایک ایک بوتل میں آدھی آدھی چمچی کالے لون کی ڈالی اور بوتل کے منہ پر انگوٹھا رکھ کے اسے اپنے اپنے منہ میں جکڑ بند کر لیا۔ دونوں بھائیوں نے اُبلتے ہوئے پانی کا ایک قطرہ بھی باہر نہ نکلنے دیا اور بڑی صفائی کے ساتھ اپنی اپنی بوتل پی گئے۔

سابو اور دینو دونوں سگے بھائی نہ تھے، چاچے تائے کی اولاد تھے لیکن دونوں میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ پیار تھا۔ ایک سے رنگ کے کپڑے پہنتے، ایک جیسی سندھی ٹوپی اوڑھتے۔ دونوں پھڈی جوتی اور لانگڑ کھینچ کے چادر باندھتے تھے۔ دونوں ہونٹوں پر ملائی مل کے..... آنکھوں میں لال سرمہ ڈالتے تھے اور دونوں موبے کلیام کی ایک ہی عورت کے عاشق تھے۔

یہ عورت ذات کی بورئن تھی اور سانڈے کا تیل بیچتی تھی۔ سردارنیوں کی مالش کرتی تھی اور سرداروں سے مالش کرواتی تھی۔ سابو اور دینو اس کو بہت اچھا جانتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے دل میں کوئی میل نہیں تھا۔ ویسے بھی ان کے دلوں میں کوئی خندق نہیں تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کی دوستیاں اور دشمنیاں سانجھی تھیں۔ دوستی تو خیر ان کی ایک ہی تھی اور آپس کی تھی لیکن دشمنیاں کافی تھیں۔ اسی لئے وہ سفر میں اور حضر میں ایک نو برنو بردا ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ اور یہ بردا ایک کلاشنکوف ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور تینوں ایک ہی وقت میں ایک ہی لینڈروور میں

سفر کرتے تھے۔

جس شام وہ پتوکی سے لاہور کی طرف چلے ہیں تو راستے میں میل بھر کے ٹوٹے پر بارش ہوئی۔ پھر موسم بالکل صاف ہو گیا۔ سابو نے دینو سے کہا "تایا غلام غوث کبھی کبھی کرتار سنگھ بلٹوہئے کا قصہ سنایا کرتے تھے تو سماں باندھ دیتے تھے۔"

دینو نے کہا "ابے نے مجھے اور بھائی کرم داد کو صرف دو مرتبہ یہ قصہ سنایا تھا لیکن تمہارے گھر آ کر وہ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اصل میں ان کو اپنی اولاد سے زیادہ اپنے بھائی کے بچوں سے پیار تھا۔"

سابو نے کہا "خیر یہ تو حقی سچی بات ہے۔ تایا غلام غوث ہم سب سے بڑی محبت کرتے تھے اور یہ محبت ہمارے ابے کی وجہ سے تھی۔ ان کو اپنا چھوٹا بھائی اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پیارا تھا۔"

دینو نے اپنے چچا زاد بھائی کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور اونچی آواز میں ایک واہیات قسم کا نعرہ لگا کر بولا "یہ ساری محبت کی کھیتیاں ہیں جن کو عشق کے پانی سیراب کر رہے ہیں بھاء! پر آگے کا علم نہیں کہ ہماری اولادوں میں بھی ایسی محبت رہتی ہے کہ نہیں۔"

"ضرور ضرور" پیچھے بیٹھا ہوا گولا بولا "جن کے بڑوں میں محبت ہوتی ہے، ان کے چھوٹے بھی عشق کے جھونٹے لیتے ہیں۔"

سابو نے کہا "اوئے داریا! تمہارے گھرانے میں بھی کبھی ہوئی ایسی محبت، ہم بھائیوں جیسی؟ یا ہمارے وڈکوں جیسی یا ہمارے پرانے پرکھوں جیسی جب ہم ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔"

دارا کچھ شرما سا گیا اور بھاگتی ہوئی لینڈ روور کے باہر دیکھ کر بولا "میرے دو نانوں میں ایسی محبت ضرور تھی، پر میں نے ان کو دیکھا نہیں۔"

دینو نے چٹک کر کہا "لکھ لعنت اوئے داریا! کبھی نانا بھی کسی کی جد پشت میں شمار ہوا ہے۔ نانکے بھی شجرے کھتونی، جمیعندی میں آئے ہیں کبھی! دادے لوگاں کی بات کر..... اونچے، لمبے سورمیاں کی۔ نانا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔"

دارا نے کلاشنکوف پر پھونک مارتے ہوئے ہولے سے کہا "ٹھیک ہے بھئی

چوہدریا، ٹھیک ہے۔ جد پشت میں تو آخر تک دادے کا لہو اور دادے کی رت ای چلتی ہے۔ نانا تو پہلے سٹیشن پر ہی اتر جاتا ہے۔"

دونوں بھائی ہنسنے لگے تو آگے پھر میل بھر کا دھواں دھار ٹوٹا آ گیا۔ بارش ہوئی نہیں تھی، پر تلی کھڑی تھی۔ کالا سیاہ سمندر بڑی ساری پکھال میں بھرا درختوں سے اوپر چھلک رہا تھا اور کسی بھی گھڑی اس کے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ لاہور ابھی کافی دور تھا۔

سابو نے کہا "میرا تایا سنایا کرتا تھا کہ ایسی ہی کالی رات تھی اور اسی طرح آسمان نے مینہ کا پرنالہ روک رکھا تھا جب سجن سنگھ بلٹوہئے کا بیٹا کرتار سنگھ گھر سے روانہ ہوا ہے۔ ماں نے کہا بھی کہ..... کاکا کل سویرے چاہے منہ اندھیرے نکل جانا پر اس وقت نہ جا۔ بوند بارش کا موسم ہے، جھڑی لگ گئی تو راستے میں ایک ہی بیڑ ہے۔ وہاں رُک بھی گیا تو تیری گھوڑی نہیں اٹکے گی۔ چار بھنیئر ناگوں کی راجدھانی میں بڑے بڑے راٹھ گھوڑے نہیں ٹھہر سکے۔ تیری گھوڑی تو پھر ابھی الھڑ بچھیری ہے، بدک کر تیری جانگھوں سے نکل جائے گی۔ کل سویرے سویرے چلے جانا اور دوپہر سے پہلے پہلے اپنے ماما کے پاس پہنچ جانا..... کرتار سنگھ نے اپنی ماں کی بات سنی ان سنی کر دی اور کالی نٹنی پر کاٹھی ڈال کر لمبے پینڈے کے لئے تیار ہو گیا۔"

سابو نے کہا "میں نے کرتار سنگھ کی تصویر دیکھی تھی۔ اس میں وہ موت کے گولے میں موٹر سیکل چلانے والے کی ساتھی لڑکی نظر آتا تھا۔ منہ پر ہلکی ہلکی داڑھی جو کانوں کے پاس جا کر گہری ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ، پگڑی کے اوپر کھانڈے کا نشان، ہونٹ بہت ہی باریک اور ناک بالکل سیدھی اور چھوٹی تھی۔ تایا جی بتایا کرتے تھے کہ وہ اپنے ڈولے پر زنجیری باندھ کر اور ڈولا پھلا کر زنجیری توڑ دیتا تھا۔ گدھے پر اپنا ہاتھ رکھ کے اور پورا زور ڈال کے گدھے کو دھرتی پر بٹھا دیتا تھا۔ زمین سے اچھل کر اور درخت کے بڑے سے ڈالے میں لٹک کر اسے اپنے ایک ہی جھکورے سے کڑاک سے توڑ دیتا تھا۔ اور نیزہ بازی میں سارے علاقے میں کوئی اس کا جوڑ نہیں تھا۔

کرتار سنگھ بلٹوہئے کی گرجی گراں کے ویدوں کی لڑکی سے یاری تھی جس کو

سوائے اس کے جانی یار گلزار کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ ویسے اس کی ماں بھی اس بھید سے واقف ہو گئی تھی کہ اس نے ایک مرتبہ کرتار کے کپڑے دھوتے ہوئے جب ان سے خنفشے، مقرقرے، شیرینہ کے بیجوں اور ملٹھی کی خوشبو آئی تو اس نے پوچھا.....

"سچ بتا کرتاریاہ وہ کون ہے جس کو تو جھپیاں ڈالتا رہتا ہے؟

اس نے پکا سا منہ بنا کر کہا مجھے گورو کی سونہہ بے بے، کوئی بھی نہیں۔ گلزار تو اینویں ای بوتیاں مارتا ہے۔ ماں نے کہا..... وے نکرمیاں مجھے اس کا نام تو بتا دے..... تو کرتار نے پھر گورو کی سونہہ کھا کر کہا، کوئی ہو تو اس کا نام بتاؤں بے بے۔ تُو تو ویسے ہی وہموں میں پڑ جاتی ہے۔"

سابو نے کہا "ویدوں کی اس لڑکی کا نام منورما تھا۔"

دینو نے پوچھا "تجھے کس نے بتایا؟" تو سابو دونوں ہاتھ منہ پر مل کے بولا "میں نے بہت سنی ہے یہ کہانی تایا جی سے۔"

"پر تجھے یہ تو پتہ نہیں ہوگا کہ کرتار سنگھ بلتوہیئے کو مارا کس نے تھا؟"

"اس کا تو کسی کو بھی علم نہیں ویر جی۔" سابو نے کہا "چھ بندے پکڑے گئے تھے۔ پانچ بری ہو گئے تھے اور ایک کو شٹن بول گئی تھی۔ وہ بھی ہائیکورٹ سے بری ہو گیا تھا۔"

دینو نے کہا "اس برکھا بھری کالی رات میں جب بیٹر کے اندر ویریوں نے کمند پھینک کر کرتارے کو گھوڑی سے گرایا ہے تو کالی نُنی الف ہو گئی۔ اس نے اپنی دونوں اگلی ٹانگیں آسمان تک اٹھا کر ویریوں پر حملہ کیا۔ لیکن وہ بچ گئے اور کرتارے کے ہردے میں برچھی گاڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اس کالی سیاہ اندھیری رات میں کالی سیاہ مشکی گھوڑی جب بھری بارش میں ننگ دھڑنگ واپس گھر پہنچی تو کرتارے کی ماں چیخ مار کر اٹھی کہ میرے کرتارے کی نُنی برباد ہو گئی لوگو۔ اس کا کلغی والا مارا گیا۔ شاہ جوان کواری کی عزت لٹ گئی۔"

اچانک موٹر کے اگلے پہیے زور سے اٹھے اور دھب سے نیچے گرے۔ پیچھے بیٹھا بروا اپنی سیٹ سے اچھلا اور چھت سے ٹکرا کر اپنی سیٹ پر آ گرا۔ دینو نے کہا "کوئی بہت ہی ظالم سپیڈ بریکر تھا۔ میرے ہاتھ سٹیرنگ پر نہ ہوتے تو میں تو کھڑکی سے باہر نکل

گیا تھا۔"

"لیکن لانگ روٹ کی مین سڑک پر آج تک کوئی سپیڈ بریکر بنا نہیں۔ یہ کچھ اور تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے چوہدری جی۔" بردے نے تائید بھرے لہجے میں کہا۔

دینو بھی سوچ میں ڈوب گیا کہ اگر یہ سپیڈ بریکر نہیں تھا تو پھر لینڈ روور اچھلی کیوں اور لمبے روٹ پر چونکہ سپیڈ بریکر نہیں ہوتے پھر گاڑی الف کیوں ہوئی اور اتنے زور سے اچھلی کیوں!"

سابو نے کہا "جب کرتارے کی موت کے ایک سال بعد اس کی ماں نے مشکی گھوڑی بیچ دی تو گاؤں والوں نے گھوڑی کو جاتے وقت روتے دیکھا۔ وہ خریدنے والے کو اچھی طرح سے جانتی اور پہچانتی تھی کہ وہ کرتارے کا بچپن کا دوست تھا لیکن کالی نٹنی نے اسے اپنے گاؤں کے اندر سوار ہونے نہ دیا۔ جب وہ بستی کی حد سے باہر ہوگئے تو گھوڑی نے اپنی تھوتھنی گورنام کے کندھے پر رگڑ کر اسے سوار ہونے کی دعوت دی اور وہ ڈرتے ڈرتے اپنے یار کی گھوڑی پر سوار ہوکر اپنے چک کی طرف روانہ ہوگیا۔"

"لاہور کتنی دور رہ گیا جی؟" کلاشنکوف والے بردے نے پیچھے سے پوچھا تو دینو نے گردن ہلائے بغیر جواب دیا "پچیس میل" —

سابو نے کہا "بڑا لمبا مقدمہ چلا۔ بے بے نے پورا رقبہ بیچ کر بیٹے کے قاتلوں کی ساری گردنیں پھندوں میں پھنسا دیں لیکن پانچ صاف بری ہوگئے اور چھٹے کو ششن بول گئی۔"

"وہ بھی ہائیکورٹ میں بری ہوگیا۔" بردے نے ہنکارا بھرا تو سابو نے اپنے چچا زاد بھائی سے کہا "ویر جی پورے چھ سال تک کرتارے کی مشکی گھوڑی نٹنی گورنام کے پاس رہی۔ لیکن کبھی کھلی نہیں۔ ویسی نہیں رہی جیسے اس عمر کی الڑھ بچھیریاں رہا کرتی ہیں۔ بجھ سی گئی اور سردیاں گرمیاں گہرے سلیٹی رنگ کا جھول پہن کے ہی سارا وقت گزار دیا۔ گورنام پٹی چھوڑتا بھی تھا اور ایڑھی بھی لگاتا تھا۔ لیکن وہ دُلکی سے آگے نہ بڑھی۔ پوئیے سرپٹ کے لئے اس کا دل ہی نہیں مانا۔ دھمالی چلتی یا رہوار، منزل پر پہنچا

دیتی لیکن کبھی سر اٹھا کر گردن کو کمانچہ نہیں بنایا۔ دل گرفتہ سی جاتی اور ویسی ہی سر نہادہ واپس آ جاتی۔ گورنام کو اس کے اندر کا دکھ معلوم تھا، اس لئے اس نے مشکی سے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا۔"

"گھوڑے کو، کتے کو اور کالے تیتر کو اپنے مالک کا بہت دکھ ہوتا ہے۔" دینو نے کہا لیکن سابو نے اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اس وقت تک اپنے تائے غلام غوث کے روپ میں اترا ہوا تھا اور فتح گڑھ چوڑیاں پہنچ چکا تھا جسے اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

سابو نے کہا "پورے چھ سال بعد جب گورنام کالی نٹنی پر سوار چک میں داخل ہو رہا تھا اور دو سانڈنی سوار اپنے بوتے کی مہار پکڑے نیائیں کے کھنگروں پر پیدل چل رہے تھے، کالی نٹنی اتنے زور سے ہنہنائی کہ گورنام کی گرفت زین پر ڈھیلی ہو گئی۔ اپنا راستہ چھوڑ کر اور دونوں کنوتیاں دبا کر نٹنی چیتے کی طرح نیائیں میں جھپٹی تو گورنام اس کی پیٹھ سے اچھل کر راستے کی موٹی دھول میں گر گیا اور اس کی تہمد کھل گئی۔

مشکی نٹنی دوسری جست میں پیدل چلتے سانڈنی سواروں کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے دونوں پچھلے سموں پر اپنا پہاڑ جیسا بدن تول کر بائیں طرف کمر لچکائی اور دائیں طرف گردن میں خم ڈال کر آسمان بھر اونچی اگلی ٹانگوں کے ساغری سم جوڑ کے سامنے والے شخص پر تین ٹن کا دوموہا ہتھوڑا چلا دیا۔ ایک، دو، تین اور جب اس نے گرے ہوئے شخص کے سر پر چوتھا وار کیا تو اس کا بھیجا دور دور تک پھیلے ہوئے کھنگروں سے جاکر چپک گیا۔ دوسرا آدمی اونٹ کی مہار چھوڑ کر بھاگا تو نٹنی کی مہیب آواز نے اس کے قدم پتھرا دیئے۔ نٹنی کی پہلے ہی وار اس کی ریڑھ کو ریزہ ریزہ کر کے توڑتی رہی۔ اونٹ کی مہار اس کے ٹیڑھے نتھنے سے ملگجی دھار کی طرح سیدھی سطیر زمین پر اتر رہی تھی۔ اور وہ بڑے اطمینان سے کھڑا جگالی کر رہا تھا۔"

لینڈ روور کے انجن سے چنگیز خان کے لشکر کی ایک خوف ناک صدا بلند ہوئی اور تقریباً تیس ہارس پاور کی ٹاپ نے اندر ایک کھڑدنبی سی مچا دی۔ دینو نے چیخ کر کہا "ویر جی ٹائی راڈ ٹوٹ گیا۔"

ایک دم بریک لگا کر جب تینوں نے نیچے اتر کر دیکھا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا

اور انجن اپنے نیوٹرل میں بڑی شائستگی کے ساتھ چل رہا تھا۔

جب سب واپس آ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے تو ہر ایک نے شکر ادا کیا کہ ٹائی راڈ صحیح سلامت ہے اور انجن اپنی فل پاور میں چل رہا ہے۔ لیکن سب حیران ضرور تھے کہ وہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ اور اس کا چنگھاڑ سے اور میدان جنگ کے گھوڑوں کی آواز سے کیسا تعلق تھا۔ پر یہ کوئی ایسی توجہ طلب بات نہیں تھی۔

اب لاہور قریب آ گیا تھا اور ان کے سامنے دو راستے تھے کہ وہ نہر کنارے یونیورسٹی کیمپس والے راستے سے گلبرگ جائیں یا وحدت روڈ پکڑ کر فیروز پور روڈ کے پل پر پہنچ جائیں۔ سابو نے کہا "وحدت روڈ ٹھیک ہے۔" لیکن جب وہ وحدت روڈ پر اقبال ٹاون کے دہانے کی سرخ بتی پر رکے تو عین ان کے سامنے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے رک کر کلاشن کوف کی ایک لہراتی ہوئی افقی باڑھ ماری۔ اسے جلدی سے دہرایا اور پھر لینڈ روور کی تیز اور چمکدار بتیوں کے سامنے تیزی سے نکل گئے۔

دینو اور سابو جنہوں نے اقبال ٹاؤن آنے پر مشکل سے علامہ اقبال کے کمال فن کی بات کر کے ان کے خواب پاکستان کا ذکر شروع ہی کیا تھا دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے۔ پچھلی سیٹ پر جو بردا کلاشن کوف سنبھالے بیٹھا تھا وہ ہسپتال جا کر ختم ہو گیا اور ان کی موٹر کو اسی مقام پر سڑک کے کنارے روک کر پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔

کچھ فٹے اور پیمانے لے کر سڑک ناپی گئی اور کچھ موٹر کا قد بت ماپا گیا۔ اس کے بعد موٹر کے اندر سے فنگر پرنٹ اور باہر سے اس کے فوٹو اتارے گئے۔ ڈی آئی جی صاحب کے حکم سے ایک سپاہی کی ڈیوٹی موٹر کے پاس لگ گئی۔ اور وہ اپنی پرانی وضع کی رائفل لے کر ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے پولیس کے چھوٹے بڑے افسروں کے ہمراہ کوئی پندرہ بیس سپاہیوں کی نفری وہاں جمع ہو گئی۔ اخباروں میں تین کالمی سرخی سے یہ خبر شائع ہوئی تھی اور اس میں دینو سابو خاندان کے اس موروثی جھگڑے کا مذکور تھا جس میں مخالف پارٹی کے تین آدمی ابھی تک جیل میں تھے۔

لینڈ روور دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی گئی تھی اور اس کے پہیوں کے آگے ایک ایک اینٹ رکھ دی گئی تھی۔ سہالہ سے دو ایکسپرٹ آ رہے تھے اور ڈی آئی جی صاحب کے خصوصی تعلقات کی بنا پر اس واردات کی بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تفتیش ہو رہی تھی۔ موسم کی خرابی کے باوصف ایک فلی آرمڈ سپاہی ہر وقت گاڑی کے باہر ڈیوٹی پر موجود تھا۔

سارا دن گزر چکا تھا لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آ سکی تھی۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار کر طرح طرح کے مال برآمد کر رہی تھی لیکن انہوں نے ابھی تک ایک بھی مشتبہ شخص گرفتار نہیں کیا تھا۔ اخبار والے البتہ چھبیس کے قریب مشتبہ اشخاص بے نقاب کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ ہر ایک کے نام کے ساتھ مبینہ لگا ہوا تھا اس لئے کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا جا سکا تھا۔ مجرم دندناتے پھر رہے تھے۔

جب رات کے بارہ بجے اور فلی آرمڈ باوردی سپاہی قریبی کھوکھے پر جا کر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا تو دونوں مجرم اپنی دوسری نئی موٹر سائیکل پر ننگے منہ اور ننگے سر، بغیر کسی ہتھیار کے دندناتے ہوئے نکلے اور لینڈ روور سے ذرا دور صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے دندنانے لگے۔ انہوں نے دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ آن ڈیوٹی سپاہی جس کا ذکر انہوں نے اخباروں میں پڑھا تھا، اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ آدھی رات کا ٹریفک اپنے روزانہ معمول کے مطابق چل رہا تھا اور وحدت روڈ پر خاصی چہل پہل تھی۔

دونوں مجرم حوصلہ کر کے موٹر کے قریب آ گئے اور اس جگہ کا جائزہ لینے لگے۔ جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے ریپڈ فائر کئے تھے اور اپنے مشن میں سو فی صد کامیاب ہو کر گھر واپس گئے تھے۔

رات کا سماں، اونچی اور مدھم سٹریٹ لائٹس، قاتلوں کے چہرے پر شیطنت، ساتھ ہی تحقیر اور خود بینی و خود رائی کے تاثرات، آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ قاتلوں کو اتنا قریب، اس قدر پرسکون اور ایسے گھمنڈی اور مغرور دیکھ کر لینڈ روور کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کی بتیاں ایک دم روشن ہو گئیں۔ پھر

اس نے فرمٹ گیئر میں ایک سو بیس میل کی سپیڈ پر اپنے آپ کو ابھارا اور اینٹوں پر سے اچھل کر بمپر جوڑے کے گورے قاتل کو ٹکر ماری جو کچھ دیکھے، سوچے، بولے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تو موٹر نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اور بائیں طرف گھوم کر بھاگتے قاتل کو زور کی ایک سائیڈ ماری اور اسے زمین پر گرا دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو لینڈ روور نے اپنا اگلا اور پچھلا پہیہ اس پر سان کی طرح چلا دیا۔ ریڑھ کی ہڈی کا چورا کرنے کے بعد اس نے اوندھے لیٹے ہوئے بے ہوش قاتل کا پنجر توڑنا شروع کیا اور جب تک اس کی پسلیوں کی چھوٹی چھوٹی گنڈیریاں نہیں بن گئیں، لینڈ روور اپنے اگلے پہیوں کی آری اسی طرح چلاتی رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن کوئی بھی کچھ سمجھ نہ سکا۔ بھاگنے والے خوف زدہ جوڑے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے یہی کہتے جا رہے تھے کہ یہ حادثہ نہیں ہے، کوئی پرانی دشمنی ہے ورنہ اندر بیٹھا ہوا ڈرائیور اس طرح سے کچوکے دے دے کر کیوں مارے!

صبح جب ڈی آئی جی صاحب اپنے تفتیشی عملے کے ساتھ موقع واردات پر آئے تو لینڈ روور اسی طرح سے اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور اس کے پہیوں کے آگے ایک ایک اینٹ بدستور رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے موقعے پر موجود محافظ سنتری سے پوچھا تو اس نے قرآن کی قسم کھا کر کہا کہ میں تو ایک منٹ کے لئے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا، صرف ایک پیالی چائے پینے گیا تھا اور اسی عرصے میں یہ سارا کھیل ہو گیا۔

ڈی آئی جی نے پوچھا "اور یہ موٹر چلا کون رہا تھا؟"

سپاہی نے ہکلاتے ہوئے کہا "جناب عالی! میرے ہوتے ہوئے تو کوئی بھی اس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ تو بعد میں ہوا۔"

"اور اس کی چابیاں کہاں تھیں؟" انہوں نے کڑک کر کہا۔

"چابیاں میرے پاس تھیں جناب عالی۔ میری برانڈی کی جیب کے اندر۔"

"تو پھر کس طرح سے موٹر سٹارٹ ہو گئی؟"

"پتہ نہیں جناب عالی۔ میں خود حیران ہوں۔"

"تم کو سوائے حیران ہونے کے اور کچھ آتا بھی ہے!" ڈی آئی جی صاحب نے غصے سے پوچھا۔ "کس نے تمہاری ڈیوٹی لگائی تھی یہاں؟"

"منشی شیر دل نے جناب عالی!"

"سبھی گولی کے لائق ہو۔" ڈی آئی جی صاحب نے تیوری چڑھا کر کہا "کیا منشی اور کیا بے منشی!"

مکینک جو بونٹ کھول کے اندر انجن کا مطالعہ کر رہا تھا، گردن باہر نکال کر بولا۔ "سر جی ویسے تو کچھ خاص سمجھ نہیں آیا، لیکن ایسے لگتا ہے کہ بیٹری ارتھ ہو گئی اور ایگنیشن آن ہو گئی۔ ایگنیشن آن ہوئی تو گاڑی خود بخود سٹارٹ ہو گئی۔ سٹارٹ ہوئی تو گیئر میں ہونے کی وجہ سے چھڑپا مار کر آگے بڑھی اور پھر سب کو لپیٹتی چلی گئی۔"

مکینک کی یہ بات سن کر گاڑی بہت مسرور ہوئی اور اس کے کاربریٹر سے ہلکی سی آواز آئی "اوئے روئیں اپنی مکینک گری کو گدھے، کبھی موٹر اس طرح سے بھی سٹارٹ ہوئی ہے!"

ملک مروت

کچھ ایسا عجیب دن بھی نہیں تھا، کچھ اس کے دماغ پر بوجھ بھی نہیں تھا۔ ایسے خیال بھی نہیں تھے جو اکثر پکڑ لیا کرتے ہیں اور ہر بندہ ان کی لپیٹ میں کوئے کے اندر محبوس ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہ ہی کسی نے کوئی فرمائش کی تھی کہ مجھے آج ہی گل بکاؤلی لا کر دو، نہ ہی گھر والوں نے بھیجا تھا اور نہ ہی اسی کا اپنا کوئی پروگرام تھا..... بس ایسے ہی گھر سے نکل پڑا اور ایسے ہی گیراج کا پھاٹک کھول کر اندر سے گاڑی نکالی اور ایسے ہی بے دھیانی میں تین مرتبہ گاڑی کا ہارن بجا کر بل کھاتی سڑکوں سے نیچے اترنے لگا۔

جب وہ سنی بینک کے پٹرول پمپ پر پہنچا تو اسے یاد آیا کہ وہ اپنا کیمرہ کھڑکی میں کھلا چھوڑ آیا ہے اور کھڑکی کا پٹ آدھا بند ہے۔ بارش نہ بھی آئی تو پھر بھی کیمرے کے بھیگ جانے کا پورا اندیشہ ہے کہ کوئی ننھا سا معصوم بادل اس کھڑکی میں داخل ہوکر جب اندر کمرے میں اترے گا تو سب سے پہلے کیمرے سے لپٹے گا۔ لیکن اب وہ واپس بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کا دل واپس جانے پر رضامند نہیں تھا۔

دانیال نے پیچھے مڑ کر دیکھا، کانوونٹ کی لڑکیوں سے بھری ایک وین اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس نے ایک طرف ہو کر وین کو راستہ دیا اور پھر سوچنے لگا کہ اگر میں یہیں سے اپنے خیال کی لیزر بیم کھڑکی پر ماروں تو کھڑکی کا پٹ فوراً بند ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنے خیال کو ایک مرکز پر مجتمع کیا اور پھر بڑی احتیاط کے ساتھ اسے ذہن کے چنگل میں پکڑ کر اس کا ایک یارکر پھینکا۔ کھڑکی کا پٹ ویسے کا ویسا کھلا رہا اور کیمرہ اسی طرح ونڈوسل کے اوپر پڑا تیرتے بادلوں کو اپنے لینز میں اتارتا رہا۔ لیکن یہ دانیال کا ایک محتاط اندازہ تھا۔ بہت ممکن ہے اس کے "بند سم سم" یارکر سے پٹ واقعی بند ہوگیا ہو

اور اس کا کیمرہ ہر طرح کی آفت سے محفوظ ہوگیا ہو! لیکن یہ "ممکن" اس کے دائرہ فکر سے بہت باہر کی چیز تھی کہ اس نے ممکنات کو منطقی فریم ورک سے باہر رکھ کر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

اس نے پیڈل پر اپنے پاؤں کا دباؤ اس لیے ڈھیلا کر دیا کہ وہ کافی تیز جا رہا تھا اور پہاڑی علاقے میں اترائی کے وقت ایسی تیزی سے نہیں جایا کرتے۔

اب گھوڑا گلی کی وسیع و عریض پاٹ دار سڑک آ رہی تھی اور دانیال کیسٹ کے ساتھ پوری آواز میں ڈوئٹ گاتے موڑ سے بڑے دھیمے انداز میں نیچے اتر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ گھوڑا گلی کے دہانے پر اپنی کار روک کر نیچے والی سڑک پر اترے گا، ایک کپ چائے پیئے گا اور پھر اسی طرح گاتا بجاتا اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ لیکن یوں نہ ہوا۔ اس کے گھوڑا گلی والے پاٹ تک پہنچتے پہنچتے اتنی دبیز دھند نیچے اتری کہ اس نے ہر نظر آنے والی شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سارے ٹریفک کی بتیاں ایک دم روشن ہوگئیں اور جو ذرا عمر رسیدہ لوگ تھے، وہ اپنی گاڑیوں کی بتیاں جلا کر اور ہینڈ بریکیں لگا کر سڑک کنارے کھڑے ہوگئے۔ دھند کے ساتھ فوراً ہی کالے بادلوں کا ایسا پرا اٹھا کہ اس نے دھند کو اپنی سیاہ چھاتی سے لپٹا لیا۔

پہاڑوں پر عام طور پر ایسے کالے بادل نہیں ہوا کرتے۔ ہوتے بھی ہیں تو پہاڑوں کی چوٹیوں کے اوپر اوپر آسمانوں کی پنہائیوں میں ہوتے ہیں، آبادیوں میں نہیں آتے۔ آبادیوں میں اترنے والے اور گھروں میں گھسنے والے بادل عام طور پر بھوسلے سے ہوتے ہیں جن کا رنگ ان عمر رسیدہ بندروں جیسا ہوتا ہے..... وہ بندر جو پہلے صرف بھوربن میں نظر آتے تھے لیکن اب باڑیاں میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔

جب ان کالے بادلوں نے ہر شے کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا تو دانیال نے چائے پینے کا ارادہ ترک کرکے اپنا سفر جاری رکھا اور اپنی ہیڈ لائٹس سے راستے کو آنکتا ہوا آگے نکلنے لگا۔ راستے میں اس نے چند ایسے جغادری ڈرائیوروں کو دیکھا جو اپنے ٹرک سڑک کنارے روک کر ان کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے تھے۔ دانیال زیر لب ان ڈرائیوروں پر مسکرایا اور پھر آگے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ پہاڑ پر نیچے اترنے کے بجائے اوپر چڑھ

رہا ہے اور اس کی سامنے کی سڑک ایک تنگ سے راستے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ گاڑی روک کر اس نے کھڑکی کا شیشہ کھولا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھندلے بادل یا بادل ملی دھند میں دیکھا لیکن وہ کوئی خاص اندازہ نہ لگا سکا کہ اس وقت وہ کدھر ہے۔ بس ایک ہلکا سا اشارہ ملتا تھا کہ وہ بڑی سڑک چھوڑ کر اوپر چڑھ گیا ہے اور ابھی اور اوپر چڑھ سکتا ہے۔ کھڑکی بند کر کے اس نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور مزید اوپر چڑھنے لگا۔

سامنے کی سڑک ایک پہاڑی راستہ تھی جس کی سخت زمین پر بڑی کڑبڑی گھاس اُگی ہوئی تھی اور جس کے دونوں کناروں پر چیڑ کے درمیانہ قد درخت ایستادہ تھے۔ دانیال اس اور اوپر چڑھتے ہوئے راستے سے اب قدرے خائف ہوگیا تھا اور اس نے گاڑی کی رفتار بے حد سست کر لی تھی۔ سپیڈو میٹر کے بموجب وہ مری سے کوئی بائیس کلومیٹر آگے آ گیا تھا اور اس کے اپنے اندازے کے مطابق اس نے آہستہ آہستہ ایک مرتبہ پھر پنڈی پوائنٹ جتنی اونچائی حاصل کر لی تھی۔

گاڑی اُسی ست روی سے چل رہی تھی اور دانیال اسی بحران و فشار کی حالت میں اسے آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ اچانک سامنے اسے کھلے راستے کا ایک وسیع ٹکڑا دکھائی دیا جس کے کنارے درخت بھی نہیں تھے اور جس کے فرش پر ویسی گھاس بھی نہیں تھی۔ ایک لمبی، کھلی اور ہموار سطح تھی جس پر گاڑی کی سپیڈ بلاخوف و خطر تیز کی جا سکتی تھی۔

جونہی دانیال نے پیڈل پر اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا، دھند میں سے چیختی ہوئی ایک آواز گاڑی کے بند شیشوں سے تڑپتی ہوئی اندر اتری..... "سٹاپ! سٹاپ!!" اور اس کے ساتھ "ڈونٹ ڈو اٹ، ڈونٹ ڈو اٹ" کی آوازیں بازگشت بن کر گونجنے لگیں۔ دانیال نے گاڑی روک لی اور انتظار کرنے لگا۔

ادھیڑ عمر کا ایک پریدہ رنگ آدمی چترالی ڈریسنگ گاؤن پہنے اور سر پر بیلا کلاوہ چڑھائے بڑی تیزی کے ساتھ گہری دھند سے نمودار ہوا اور موٹر کی کھڑکی کے پاس رک کر کھڑا ہو گیا۔ دانیال نے جلدی سے شیشہ اتار کر اسے سلام کیا اور اس کے خوبصورت عمر رسیدہ چہرے کی رنگت دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ اس کی جلد سنہرے گلابی رنگ کی تھی، منہ اور دونوں ہونٹ شفقت کے جوس سے لبریز تھے اور آنکھیں خود

تشبیہی سگنل پر چوکسی کے انداز کی تھیں۔

ادھیڑ عمر کے اس شفیق آدمی نے اپنا دایاں ہاتھ ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے نکال کر فضا میں لہرایا اور گھبرا کر بولا "میاں آپ نے تو حد کر دی جو اس خلا کے دہانے تک گاڑی لے آئے اور پھر اس گہری کھائی کو چٹیل میدان سمجھ کر یہاں اپنی رفتار اور بھی تیز کرنے لگے تھے۔ ذرا باہر نکل کر تو دیکھئے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔"

دانیال گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کا پاؤں ایک چھوٹے سے گڑھے میں اترنے کی وجہ سے بل کھا گیا۔ اس نے گھوم کر گرنے کی شرمندگی سے بچتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی ہلکی سی تالی بجائی اور پاؤں جما کر بولا "سر! یہ کون سی جگہ ہے اور میں کہاں آ گیا ہوں؟"

خوبصورت بزرگ نے کہا "یہ بھی آپ ہی کا علاقہ ہے، آپ ہی کا وطن ہے اور آپ ہی کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے لیکن آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ آپ کا راستہ نہیں ہے۔ آپ کا زمان و مکان نہیں ہے۔"

دانیال نے کہا "سر! ذرا سی دھند چھٹ جائے اور مطلع صاف ہو جائے تو پھر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے کس طرف کو نکلنا چاہیے۔"

"جب تک آپ ہمارے یہاں رُکیں" بزرگ نے کہا "ایک کپ کافی پئیں، ذرا سا ستائیں اور پھر جب سورج گرم ہو کر دھند کو کاٹ دے تو بھلے اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔"

دانیال بزرگ کا شکریہ ادا کر کے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ پگڈنڈی پر سے اتر رہے تھے تو دانیال نے دیکھا کہ اس کے گھر کو جانے والا راستہ بہت ہی خوش گوار اور بے حد موافق، مہربان اور نیاز مند سا تھا۔ جیسے جیسے وہ چلتے جا رہے تھے، راستہ انہیں راہ دیتا جا رہا تھا۔ ایک قدم اٹھانے پر پانچ پانچ قدم ادب کے مارے خود ہی نیچے سے سرک جاتے تھے۔

جلد ہی وہ اس بزرگ کے گھر پر پہنچ گئے۔

یہ پرانی وضع کی ایک مضبوط اور سنگین کوٹھی تھی جو پتھروں کو گھڑ کے بنائی گئی تھی اور جس کے دو بڑے دود کشوں سے ملگجے رنگ کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ باہر کا آہنی

گیٹ بھاری لوہے کا بنا تھا اور اس پر کوئی ایک ہفتہ پہلے کا سندھوری پینٹ جگمگا رہا تھا۔

یوں تو دھند کے سمندر میں ہر شے موٹے ٹھنڈے دھوئیں میں لپٹی ہوتی ہے اور جوں جوں آگے بڑھیں ہر لپٹی ہوئی شے کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں لیکن اس جگہ کا کچھ عجیب معاملہ تھا کہ قریب آنے پر نہ صرف ہر شے واضح ہوتی جاتی تھی بلکہ اس پر روشنی کا ایک ہالا سا بھی پھیل جاتا تھا جو سٹیج پر گاتی ہوئی بغیر تنانوں کی سیاہ گاؤن پہنے پریمادونا پر پڑا کرتا ہے۔

کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے دانیال نے گیٹ کے دائیں کونے پر بزرگ کے نام کی کالی سیاہ تختی دیکھی جس پر براق حروف میں اس کا نام لکھا تھا..... ملک مروت۔ ملک تو صاف نظر آتا تھا مگر نیم پلیٹ کے عین درمیان میں ایک گھنی جنگلی بیل کے چڑھ جانے سے ملک صاحب کا نام پورا دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک آخر کی ت تھی جو اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کدھر سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بیل کیمرے کے شٹر کی طرح ایک سیکنڈ کے سوویں حصے کے لیے ادھر کو ہٹی تو دانیال کو ملک مروت کا پورا نام ایک کوندے کی طرح نظر آیا اور پھر اس طرح سے چھپ گیا۔

ڈرائنگ روم کے اندر آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور کھنگلوں کا ایک بڑا سا ٹوکرا قریب ہی رکھا تھا۔ وکٹورین طرز کے صوفے اُسی زمانے کی یاد دلاتے تھے کیونکہ ان کی لکڑی ساگوان کی تھی اور اپنی ہیت سے وہ بے حد وزنی نظر آتے تھے۔ ان کی پوشش بھی اسی زمانے کی تھی۔ کمرے کے اندر کی فضا نگھی نگھی، یار باش اور جپھی مار قسم کی تھی۔ تھکے مرتے دانیال کو صوفے پر بیٹھ کر بڑا لطف آیا اور اس کی آدھی لکنت دور ہوگئی۔

صوفے کے دوسری جانب ایک اونچی سی آبنوسی میز پر پرانی وضع کے "آن لکر"، "ٹیٹ لر"، "پنچ" اور "السٹریٹڈ ویکلی" کے رسالے پڑے تھے۔ دانیال نے حیرانی سے ان رسالوں کو دیکھا اور ابھی وہ ان تک پہنچا نہیں تھا کہ ملک مروت گرم گرم کافی کا ایک بڑا مگ اور ساتھ کوکونٹ اور جنجر کے بسکٹ لے کر آ گئے۔ دانیال اٹھ کر کھڑا ہوگیا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "بیٹھئے بیٹھئے، تشریف رکھئے۔ آج ہمارے

یہاں چھٹی کا دن ہے۔ سارے ملازم اپنے اپنے کام سے گئے ہیں۔ صرف ایک کمبل لپیٹ کر گہری نیند سو رہا ہے اور میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا —"

دانیال نے بات کاٹ کر کہا "آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ مجھے تو آپ کے گھر کے محبتی ماحول نے ہی اتنا کچھ عطا کر دیا ہے کہ اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔"

"ضرورت کیوں نہیں تھی" ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ اتنی دور ڈرائیو کر کے ہمارے علاقے میں آئے ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں، ہمارا اتنا بھی فرض نہیں کہ اس بھیگے ہوئے موسم میں آپ کو کافی کے دو گھونٹ پیش کر سکیں۔"

دانیال نے کہا "آپ کا تو چہرہ ہی ایسا خوشگوار اور پُربہار ہے کہ آدمی سب کچھ بھول کر اسی میں محو ہو جاتا ہے۔ اوپر سے آپ کا نام، داد و عطا کا منبع، شرافت کا مرکز۔ پھر آپ کا بات کرنے کا انداز —"

ملک صاحب نے کہا "اگر آپ غسل خانے جانا پسند کریں تو وہ سامنے سکرین کے پیچھے واش روم ہے۔"

دانیال نے "جی نہیں شکریہ" کہہ کر کافی کا مگ ہونٹوں سے لگایا تو وہ پہلے ہی جرعے میں ایک کے ساتھ دو سپ لے گیا۔ ایسی کافی اس نے اپنی زندگی میں پہلے نہیں پی تھی۔ وہ چینی کے بھاری مگ کو اور کافی کے نسواری مگر نوری رنگ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مگ میں اور کافی میں کچھ عجیب طرح کا تعلق تھا! اس نے اپنے تحیر کو چھپاتے ہوئے کہا "ملک صاحب آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟"

"اب تو مجھے اکیلا ہی سمجھئے لیکن پہلے ایسا نہیں تھا۔ گو اس وقت بھی میرے ساتھ میرے نوکر چاکر، ملازم پیش خدمت اور کارندے سبھی لوگ رہتے ہیں لیکن اپنے انداز میں، میں اکیلا ہوں۔"

"اور کب سے آپ یہاں ہیں؟" دانیال نے حیرانی سے پوچھا۔

"ایک مدت ہی ہو گئی اور اب تو مجھے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ اس کوٹھی میں سکاچ کمپنی کا ایک کمانڈر رہتا تھا — اور ادھر اور بھی بہت سے کمانڈروں کی کوٹھیاں تھیں جو گرمیاں گزارنے یہاں آیا کرتے تھے۔ ان کی کمپنیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں جو